معراج کا پیغام

از

سید علی گیلانی

تحریک حریت جموں کشمیر

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم ہ

معراج کا پیغام

معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے مکۃ المکرمہ میں پیش آیا۔ مکی زندگی کے اس آخری دور میں قریش کی ایذا رسانیاں آخری حدود پھاند چکی تھیں۔ اب وہ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا چراغ بجھانے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ ان ناپاک منصوبوں کی تکمیل سے پہلے ہی ربّ کائنات نے اپنے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربارِ خاص میں بلایا اور اس بات کا برملا اعلان کر دیا کہ "فرش والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر نہیں پہچانتے ہیں۔ لیکن عرش والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت سے بخوبی آگاہ ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزاتی طور حرم پاک سے رات کے وقت اُٹھا کر مسجد اقصیٰ اور پھر عالم بالا کی سیر کرا کے آپ کو اپنی خاص خاص نشانیوں کی آگاہی بخشنا چاہتا ہے"۔ چنانچہ فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ہ﴾ (بنی اسرائیل، ۱)

"پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے، تا کہ اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔"

اسی واقعہ کو قرآنی اصطلاح میں ''معراج'' اور ''اِسراء'' کہتے ہیں۔ یہ سفر جسمانی تھا، روحانی تھا یا خواب میں تھا۔ اس بارے میں صاحبِ تفہیم القرآن مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح ملاحظہ ہو۔

''اس سفر کی کیفیت کیا تھی؟ یہ عالم خواب میں پیش آیا تھا یا بیداری میں؟ اور آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محض روحانی طور پر ہی آپ کو یہ مشاہدہ کرا دیا گیا؟ ان سوالات کا جواب قرآن مجید کے الفاظ خود دے رہے ہیں۔ سُبْحٰنَ الَّذِیٓ اَسْرٰی سے بیان کی ابتداء کرنا خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارقِ عادت واقعہ تھا۔ جو اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے رونما ہوا۔ ظاہر ہے کہ خواب میں کسی شخص کا اس طرح کی چیزیں دیکھ لینا، یا کشف کے طور پر دیکھنا یہ اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے بیان کرنے کیلئے اس تمہید کی ضرورت ہو کہ تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو یہ خواب دکھایا یا کشف میں یہ کچھ دکھایا۔ پھر یہ الفاظ بھی کہ ''ایک رات اپنے بندے کو لے گیا'' جسمانی سفر پر صریحاً دلالت کرتے ہیں۔ خواب کے سفر، یا کشفی سفر کے لئے یہ الفاظ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔''

(بحوالہ تفہیم القرآن)

تیرہ سالہ مکی زندگی کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ پاک کی طرف ہجرت کرنا تھی۔ اُس سرزمین کے باشندوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے پیغام اور مشن کو وہاں آ کر پھیلائیں۔ دینِ اسلام کو قائم کریں۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ انصار مدینہ نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکۃ المکرمہ میں بیعت عقبہ کے موقع پر مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی۔ وہ اس کے نتائج اور عواقب سے ناواقف نہیں تھے وہ بخوبی جانتے تھے کہ اُن کو مدینہ آنے کی دعوت دینا پورے عرب کے ساتھ اعلانِ جنگ کے مترادف ہے۔ چنانچہ اس موقع پر جو وفد بیعت کر رہا تھا اُن میں سے ایک نوجوان رُکن اسعد بن زرارہؓ نے جو پورے وفد میں سب سے کم سن شخص تھے۔ اُٹھ کر کہا۔

ترجمہ "ٹھہرو اے اہل یثرب ہم لوگ جو اِن کے پاس آئے ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے آئے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آج انہیں یہاں سے نکال کر لے جانا تمام عرب سے دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر برسیں گی۔ لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ پکڑو اور اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو پھر چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کرو کیونکہ اس وقت عذر کر دینا خدا کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے"

اسی بات کو وفد کے ایک دوسرے شخص عباس بن عبادہ بن نضلہؓ نے دہرایا

ترجمہ " جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟

(آوازیں ہاں جانتے ہیں) تم اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے، دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو۔ پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اُسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے۔ تو بہتر ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہے کہ جو بلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اس کو اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے باوجود نباہو گے۔ تو بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم یہ دُنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔"

ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے لوگوں کو بھرپور احساس تھا کہ ہم خطرات مول لے رہے ہیں۔ اس لئے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک مشن لے کر آئے تھے۔ ایک کامل نظام زندگی لے کر آئے تھے۔ معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کرنے کے ساتھ وہ بنیادی اصول بھی بتا دئے جن کے مطابق مدینہ میں اسلامی ریاست کو منصئہ شہود پر لانا تھا۔ یہ اصول آپ ان صفحات میں پڑھیں گے کہ مکمل نظامِ زندگی کے خدوخال اور اساسی اصول کیا ہیں۔ چنانچہ مدینہ میں آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو جو انصار اور مہاجرین کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے انہی اصولوں کے مطابق اُن کی تربیت سے ایک معاشرہ تعمیر کیا اور پھر انہی بنیادی اصولوں پر ایک ریاست تشکیل دیدی جس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود سربراہ تھے۔

سادہ اور عام فہم الفاظ میں آپ یوں سمجھئے کہ معراج کے موقع پر ایک سال پہلے اسلامی ریاست کا منشور اجراء کر دیا گیا۔ یہ منشور سورہ بنی اسرائیل میں پیش کر دیا گیا۔ آیت ۲۳ سے آیت ۳۸ تک ہم نے دورِ جدید کی آسان ترین تفسیر تفہیم القرآن جس کے بارے میں مرحوم مولانا عامر عثمانی فاضل دیوبند نے فرمایا ہے کہ یہ عربی مبین کو اردوئے مبین میں پیش کی گئی تفسیر ہے۔ آیات کا ترجمہ اور تشریح ان صفحات میں پیش کی گئی ہے۔ آپ اگر توجہ، دلچسپی اور خالی الذہن ہو کر ان آیات اور تشریحات کا مطالعہ کریں گے۔ آپ یہ بات سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ ان اصولوں میں اللہ کی حاکمیت تسلیم کرنے اور اسلامی ریاست کی بنیاد بنانے، پھر والدین کی اطاعت، اُن کے ادب واحترام اور تعظیم کے تقاضے پورے کرنے کی تاکیدی ہدایات دیکر ایک صالح خاندان کے تقاضے پورے کئے گئے ہیں۔ پھر معاشرتی خرابیوں کے علاج کے لئے اسراف سے بچنے، اختلاطِ مرد و زن سے احترازِ کرنے، بخل اور اسراف سے پرہیز کرنے، خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر قتل اولاد سے پرہیز کرنے اور زِنا جیسے شنیع فعل سے ہی نہیں بلکہ اُس کے اسباب و محرکات سے دور رہنے کی ہدایات ہیں۔ انسانی جان کے احترام کا عالمگیر اور آفاقی اصول، جس کی آج کے سماج اور معاشرے میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یتیم کے مال کی حفاظت اور صیانت، پھر عہد و پیمان کی پابندی اوزان اور ناپ تول میں دیانت اور امانت داری کا مظاہرہ پھر سنی سنائی باتوں اور اُن خیالی فلسفوں کے پیچھے پڑ جانے اور اُن پر زندگی کی تعمیر کے منصوبے اپنانے سے بچنے کی تلقین، قوتِ باصرہ، قوت سامع اور فکر و تدبر کے بارے میں جوابدہی کے احساس کو اُبھارنے کی ضرورت پوری کر دی گئی۔ بڑے بڑے بنیادی اور

اساسی اصولوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اترا کر اور غرور تکبر کے ساتھ چلنے سے بھی روکا گیا ہے۔ یہ معراج کا پیغام ہے۔

اب اس روشنی میں آپ آج کے مسلم معاشرے پر نگاہ ڈالئے کہ ہم از سرتا پا اس ابدی اور حیات بخش نظام سے بالکل نا آشنا بنادئے گئے ہیں۔ ہمارے یہاں معراج شریف کے موقع پر بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں جن میں اختلاطِ مردوزن بھی ہوتا ہے وہ اعمال اور افعال بھی ہوتے ہیں جن کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھا جائے تو بغیر کسی لاگ لپٹ کے کہا جاسکتا ہے کہ ہم معراج عالم کے نام پر اُس شرک اور بدعات کو فروغ دے رہے ہیں جن کے مٹانے کے لئے صاحب معراج صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔

معراج کا پیغام یہ ہے کہ ہم اللہ کی حاکمیت کے بغیر کسی اور قوت وطاقت کی حاکمیت تسلیم نہ کریں۔ بلکہ اُس کے خلاف بغاوت کریں اور کوئی ایسا سیاسی اور سماجی نظام قبول نہ کریں جس کی بنیاد اللہ کی وحدانیت، حاکمیت، بالا دستی، قرآن کے دستورِ حیات اور رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط قیادت کی بنیاد پر نہ ہو۔ آج ہمارا سیاسی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام، تعلیمی نظام، قانونی نظام، صلح اور جنگ کا نظام، انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کا نظام مکمل طور غیر اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ معراج عالم کے موقع پر جو اصول اور منشور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے عطا کردیا گیا تھا وہ نظام ہم مکمل طور بھول چکے ہیں۔ اُس کا تصور اور احساس تک مٹادیا گیا ہے اور ہمارا مسلم معاشرہ بے روح رسمیں ادا کرکے معراج

شریف کی یاد منا کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ ہم نے معراج کا مقدس دن بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

اقبالؒ

آج ۱۴۲۸ھ ہجری اور 2007ء کے سال میں ہم معراج شریف کا استقبال کرنے جا رہے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ اس موقع پر اپنے پڑھے لکھے نوجوانوں تک معراج کا پیغام پہونچائیں تا کہ وہ موازنہ کریں کہ معراج کا پیغام کیا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ مساجد اور زیارت گاہوں پر ہمارے بڑے بڑے اجتماعات کیا تصویر پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے واعظ اور خطیب اس عظیم اور تاریخ ساز واقعہ کے بارے میں عام مسلمانوں کو کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ معراج کے موقع پر پیش کئے گئے اسلامی ریاست کے اس منشور کے بارے میں اُن کا کیا تصور اور under standing ہے۔ استعماری اور استبدادی قوتوں کے اس شکنجے میں جکڑے جانے کی صورت میں ہم اپنی اسلامی اور دینی شناخت بچانے کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ ہمارا معاشرہ کس برق رفتاری کے ساتھ بگاڑ اور فساد کا شکار ہو رہا ہے۔ ہم اس کے سدباب اور توڑ کے لئے کیا کوششیں کر رہے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں ہمارا خون کتنا ارزاں ہو چکا ہے۔ ہماری عزتیں اور عصمتیں کس بے دردی، بے رحمی اور بے حیائی کے ساتھ لوٹی جارہی ہیں۔ تازہ ترین واقعات میں کنگن، بانڈی پورہ، کپوارہ اور 20/ جولائی کو بٹہ پورہ لنگیٹ میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تابندہ غنی کی لرزہ خیز اور دل ہلا دینے والی

آبروریزی اور پھر بہیمانہ قتل، کیا ہمارے ضمیر اور دینی غیرت کے لئے بہت بڑا چیلنج نہیں ہے؟ کیا ہم ان دلدوز واقعات کے ہوتے ہوئے بھی سڑکوں، مدرسوں، ہسپتالوں، ڈیلی ویجری، فلائی اورس اور مادی مراعات کے عوض غلامی، ذلت اور خواری کی زندگی پر قناعت کریں؟ اور اس کے خلاف ذہناً اور عملاً یکسو ہوکر ان سونے کی زنجیروں کو کاٹنے اور توڑ پھینکنے میں سرگرم عمل نہ ہو جائیں؟ ان تازہ ترین حادثات کے رونما ہونے پر مظلوم عوام نے جس ہمت، حوصلہ اور جرأت مندی کا اظہار کر کے منظم اور بڑے بڑے مظاہرے کئے کاش یہ حوصلے اور انداز کار مستقبل کا لائحہ عمل بن جائے اور ہم غیر اسلامی اور مشرکانہ تہذیب کے غلبہ سے نجات حاصل کر کے معراج العالم میں عطا کئے گئے منشور کے مطابق اسلامی ریاست اور نظام قائم کرنے کا ملّی اور دینی فریضہ انجام دینے کے لئے یکسو اور یک رُخ ہو جائیں۔ لادین سیاست اور نظام کے علمبرداروں سے اُسی طرح اعلانِ برأت کریں جس طرح لنگیٹ علاقہ کے عوام نے 20 رجولائی کے دلدوز حادثہ کے موقع پر کیا ہے۔ ہماری مظلوم اور محکوم قوم اس بات کو ذہن نشین کرے کہ جب کسی غلام قوم میں بے داری آجاتی ہے تو آسمان کے فرشتوں کے لئے وہ عید اور مسرت کا دن ہوتا ہے۔

عرشیاں را روز عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمے ملتے

اقبالؒ

معراج شریف کے موقع پر رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمثیلی انداز میں ملّت مرحومہ میں نفوذ پائے ہوئے منکرات اور غیر اسلامی عادات و بدعات میں مبتلا

افراد کی دل دہلا دینے والی سزائیں دکھائی گئی ہیں۔ اس حدیث پاک کو ''زادِ راہ'' کتاب سے نقل کر کے قارئین کے لئے پیش کر دیا گیا ہے تا کہ اس آئینے میں ہم اپنا جائزہ لیں اور محاسبہ کریں اور آخرت کی ان ابدی اور ہلاکت آفرین سزاؤں سے بچنے کے لئے دنیوی زندگی میں ان سے پرہیز اور دوری اختیار کریں۔ بُرے اعمال اور آخرت کے برباد کردینے والے منکرات سے بچنے کے لئے موت کا انتظار کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ موت بغیر پوچھے آتی ہے اور آخرت کی زندگی پر یقین کا تقاضا ہے کہ ہم بغیر کسی انتظار کے اپنی زندگیوں کو منکرات اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے خلاف اعمال سے پرہیز کریں اور اپنی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے نہ تو خود انتظار کریں اور نہ دوسروں کی طرف دیکھیں کہ وہ کب اصلاح کا آغاز کریں تو اُس کے بعد ہم کریں گے۔ یہ قطعاً غیر اسلامی اور آخرت فراموشی کی سوچ ہے۔ اس لئے فرصتِ اول میں اپنی زندگی اور اعمال کو پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ ان گذارشات کے ساتھ ساتھ تفہیم القرآن کی ان آیات کا ترجمہ اور حدیث پاک کا ترجمہ بھی مطالعہ فرمایئے۔ اللہ غفور و رحیم سے عاجزانہ التماس ہے کہ وہ ہمیں عمل کی توفیق سے نوازے تا کہ ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے اور دنیا و آخرت میں ہم فلاح و کامرانی سے سرفراز ہو جائیں۔ وَمَا ذَالِکَ علی اللہ لعزیز!

خیر اندیش

سید علی گیلانی

تاریخ 23 / جولائی 2007ء

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط﴾

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝﴾ (بنی اسرائیل،23)

"(۱) تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اُس کی [۲۶] (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو"

[۲۶] اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش اور پوجا نہ کرو، بلکہ یہ بھی ہے کہ بندگی اور غلامی اور بے چون وچرا اطاعت بھی صرف اسی کی کرو، اسی کے حکم کو حکم اور اسی کے قانون کو قانون مانو اور اس کے سوا کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔ یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ اور صرف انفرادی طرزِ عمل کے لئے ایک ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ اُس پورے نظامِ اخلاق وتمدن وسیاست کا سنگِ بنیاد بھی ہے جو مدینہ طیبہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قائم کیا۔ اس کی عمارت اسی نظریے پر اٹھائی گئی تھی کہ اللہ جل شانہ ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے اور اسی کی شریعت ملک کا قانون ہے۔

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل،24)

"اور نرمی ورحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو، اور دُعا کیا کرو کہ

''پروردگار'' ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔''

﴿ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل،25)

''تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لئے درگذر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔'' [۲۷]

[۲۷] اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ اولاد کو والدین کا مطیع، خدمت گزار اور ادب شناس ہونا چاہیے۔ معاشرے کا اجتماعی اخلاق ایسا ہونا چاہیے جو اولاد کو والدین سے بے نیاز بنانے والا نہ ہو بلکہ ان کا احسان مند اور ان کے احترام کا پابند بنائے اور بڑھاپے میں اُسی طرح ان کی خدمت کرنا سکھائے جس طرح بچپن میں وہ اس کی پرورش اور ناز برداری کر چکے ہیں۔ یہ آیت بھی صرف ایک اخلاقی سفارش نہیں ہے بلکہ اسی کی بنیاد پر بعد میں والدین کے وہ شرعی حقوق و اختیارات مقرر کیے گئے جن کی تفصیلات ہم کو حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آدابِ تہذیب میں والدین کے ادب اور اطاعت اور ان کے حقوق کی نگہداشت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ان چیزوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام اور تعلیمی پالیسی کے

ذریعہ سے خاندان کے ادارے کو مضبوط اور محفوظ کرنے کی کوشش کرے گی نہ کہ اسے کمزور بنانے کی۔

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل،26)

(۳) رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق۔

(۴)۔ فضول خرچی نہ کرو۔

﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل،27)

فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

﴿ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل،28)

(۵)۔ اگر اُن سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو جس کے تم اُمید وار ہو تلاش کر رہے ہو، تو انہیں نرم جواب دے دو[۲۸]۔

[۲۸] ان تین دفعات کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور اپنی دولت کو صرف اپنے لیے ہی مخصوص نہ رکھے، بلکہ اپنی ضروریات اعتدال کے ساتھ پوری کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں، اپنے ہمسایوں اور دوسرے حاجتمند لوگوں کے حقوق بھی ادا کرے۔ اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی اور حق شناسی و حق رسانی کی روح جاری و ساری ہو۔ ہر رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا معاون، اور ہر مستطیع انسان اپنے پاس کے محتاج انسان کا مددگار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے اپنے

آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے۔ معاشرے میں حق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص اُن سب انسانوں کے حقوق اپنی ذات پر اور اپنے مال پر محسوس کرے جن کے درمیان وہ رہتا ہو۔ اُن کی خدمت کرے تو یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ ان کا حق ادا کر رہا ہے، نہ یہ کہ احسان کا بوجھ ان پر لا د رہا ہے۔ اگر کسی کی خدمت سے معذور ہو تو اُسے مافی مانگے اور خدا سے فضل طلب کرے تا کہ وہ بندگان خدا کی خدمت کرنے کے قابل ہو۔

منشورِ اسلامی کی یہ دفعات بھی صرف انفرادی اخلاق کی تعلیم ہی نہ تھیں، بلکہ آگے چل کر مدینہ طیبہ کے معاشرے اور ریاست میں انہی کی بنیاد پر صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ کے احکام دیے گئے، وصیت اور وراثت اور وقف کے طریقے مقرر کیے گئے، یتیموں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا گیا، ہر بستی پر مسافر کا یہ حق قائم کیا گیا کہ کم از کم تین دن تک اس کی ضیافت کی جائے، اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی نظام عملاً ایسا بنایا گیا کہ پورے اجتماعی ماحول میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی روح جاری وساری ہوگئی، حتیٰ کہ لوگ آپ ہی آپ قانونی حقوق کے ماسوائے اُن اخلاقی حقوق کو بھی سمجھنے اور ادا کرنے لگے جنہیں نہ قانون کے زور سے مانگا جا سکتا ہے نہ دلوایا جا سکتا ہے۔

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴾ (بنی اسرائیل،29)

(۶)۔ نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کُھلا چھوڑ دو کہ

ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ [۲۹]

۲۹۔ ہاتھ باندھنا استعارہ ہے بخل کے لئے، اور اس سے کھلا چھوڑ دینے سے مراد ہے فضول خرچی۔ (دفعہ 4 کے ساتھ دفعہ 6) ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اتنا اعتدال ہونا چاہیے کہ وہ نہ بخیل بن کر دولت کی گردش کو روکیں اور نہ فضول خرچ بن کر اپنی معاشی طاقت کو ضائع کریں۔ اس کے برعکس ان کے اندر توازن کی ایسی صحیح حسِ موجود ہونی چاہیے کہ وہ بجا خرچ سے باز بھی نہ رہیں اور بیجا خرچ کی خرابیوں میں مبتلا بھی نہ ہوں۔ فخر اور ریا اور نمائش کے خرچ، عیاشی اور فسق و فجور کے خرچ، اور تمام ایسے خرچ جو انسان کی حقیقی ضروریات اور مفید کاموں میں صرف ہونے کے بجائے دولت کو غلط راستوں میں بہادیں، دراصل خدا کی نعمت کا کفران ہیں۔ جو لوگ اس طرح اپنی دولت کو خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

یہ دفعات بھی محض اخلاقی تعلیم اور انفرادی ہدایات تک محدود نہیں ہیں بلکہ صاف اشارہ اس بات کی طرف کر رہی ہیں کہ صالح معاشرے کو اخلاقی تربیت، اجتماعی دباؤ اور قانونی پابندیوں کے ذریعہ سے بے جا صرف مال کی روک تھام کرنی چاہئے۔ چنانچہ آگے چل کر مدینہ طیبہ کی ریاست میں اُن دونوں دفعات کے منشاء کی صحیح ترجمانی مختلف عملی طریقوں سے کی گئی۔ ایک طرف فضول خرچی اور عیاشی کی بہت سی صورتوں کو از روئے قانون حرام کیا گیا۔ دوسری طرف بالواسطہ قانونی تدابیر سے بے جا صرف مال کی روک تھام کی گئی۔ تیسری طرف معاشرتی اصلاح کے ذریعہ سے اُن بہت سی رسموں کا

خاتمہ کیا گیا جن میں فضول خرچیاں کی جاتی تھیں پھر حکومت کو یہ اختیارات دیے گئے کہ اسراف کی نمایاں صورتوں کو اپنے انتظامی احکام کے ذریعہ سے روک دے اسی طرح زکوٰۃ وصدقات کے احکام سے بخل کا زور بھی توڑا گیا اور اس امر کے امکانات باقی نہ رہنے دیے گئے کہ لوگ زراندوزی کر کے دولت کی گردش کو روک دیں۔ ان تدابیر کے علاوہ معاشرے میں ایک ایسی رائے عام پیدا کی گئی جو فیاضی اور فضول خرچی کا فرق ٹھیک ٹھیک جانتی تھی اور بخل اور اعتدال میں خوب تمیز کرتی تھی۔ اس رائے عام نے بخیلوں کو ذلیل کیا۔ اعتدال پسندوں کو معزز بنایا۔ فضول خرچوں کو ملامت کی اور فیاض لوگوں کو پوری سوسائٹی کا گلِ سرِ سَبَد قرار دیا۔ اس وقت کی ذہنی واخلاقی تربیت کا یہ اثر آج تک مسلم معاشرے میں موجود ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہیں کنجوسوں اور زراندوزوں کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سخی انسان آج بھی ان کی نگاہ میں معزز و محترم ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل،30)

تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔[۳۰]

۳۰۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی بخشش میں کم وبیش کا جو فرق رکھا ہے انسان اس کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا تقسیم رزق کے فطری نظام میں انسان کو اپنی مصنوعی تدبیروں سے

دخل انداز نہ ہونا چاہیے۔ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا، اس نامساوات کو فطرت کی حدود سے بڑھا کر بے انصافی کی حد تک پہنچا دینا، دونوں ہی یکساں غلط ہیں۔ ایک صحیح معاشی نظام وہی ہے جو خدا کے مقرر کئے ہوئے طریقِ تقسیم رزق سے قریب تر ہو۔

اس فقرے میں قانون فطرت کے جس قاعدے کی طرف رہنمائی کی گئی تھی اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخیل سرے سے کوئی راہ نہ پا سکا کہ رزق اور وسائلِ رزق میں تفاوت اور تفاضُل بجائے خود کوئی برائی ہے جسے مٹانا اور ایک بے طبقات سوسائٹی پیدا کرنا کسی درجے میں بھی مطلوب ہو۔ اس کے برعکس مدینہ طیبہ میں انسانی تمدن کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے جو راہ عمل اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ فطرتُ اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت پر برقرار رکھا جائے اور اوپر کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق سوسائٹی کے اخلاق واطوار اور قوانین عمل کی اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ معاش کا فرق وتفاوت کسی ظلم و بے انصافی کا موجب بننے کے بجائے اُن بے شمار اخلاقی، روحانی اور تمدنی فوائد وبرکات کا ذریعہ بن جائے جن کی خاطر ہی دراصل خالقِ کائنات نے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق وتفاوت رکھا ہے۔

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴾ (بنی اسرائیل، 31)

(۷) اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق

دینگے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت اُن کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔ ۱۳۱

۱۳۱۔ یہ آیت اُن معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اُٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے میں قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہُوا کرتا تھا اور آج وہ ایک تیسری تدبیر، یعنی منع حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن منشور اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر اُن تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی رو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائشِ نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے، بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے اُتنے ہی، بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں۔ لٰہذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نزول قرآن کے دور سے لے کر آج تک کسی

دور میں بھی مسلمانوں کے اندر نسل کُشی کا کوئی عام میلان پیدا نہیں ہونے پایا۔

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴾

(بنی اسرائیل،32)

(۸)۔زنا کے قریب نہ پھٹکو۔وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ۔۳۲

۳۲۔ ''زنا کے قریب نہ پھٹکو''، اس حکم کے مخاطب افراد بھی ہیں، اور معاشرہ بحیثیت مجموعی بھی۔افراد کے لئے اس حکم کے معنی یہ ہیں کہ وہ محض فعلِ زنا ہی سے بچنے پر اکتفا نہ کریں، بلکہ زنا کے مقدِمات اوراس کے اُن ابتدائی محرکات سے بھی دور رہیں جو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔رہا معاشرہ تو اس حکم کی رو سے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں زنا اور محرکاتِ زنا اور اسبابِ زِنا کا سدِ باب کرے اور اس غرض کے لئے قانون سے، تعلیم و تربیت سے، اجتماعی ماحول کی اصلاح سے، معاشرتی زندگی کی مناسب تشکیل سے اور دوسری تمام مؤثر تدابیر سے کام لے۔

یہ دفعہ آخر کار اسلامی نظامِ زندگی کے ایک وسیع باب کی بنیاد بنی۔اس کے منشا کے مطابق زنا اور تُہمتِ زنا کو فوجداری جرم قرار دیا گیا، پردے کے احکام جاری کئے گئے، فواحش کی اشاعت کو سختی کے ساتھ روک دیا گیا، شراب اور موسیقی اور رقص اور تصاویر پر (جو زنا کے قریب ترین رشتہ دار ہیں) بندشیں لگائی گئیں، اور ایک ایسا ازدواجی قانون بنایا گیا جس سے نکاح آسان ہوگیا اور زنا کے معاشرتی اسباب کی جڑ کٹ گئی۔

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ
مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل، 33)

(۹)۔ قتلِ نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ ۳۳ مگر حق کے ساتھ ۳۴ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اُس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے ۳۵، پس چاہیے کہ قتل میں حد سے نہ گزرے ۳۶، اُس کی مدد کی جائے گی۔ ۳۷

۳۳۔ قتلِ نفس سے مراد صرف دوسرے انسان کا قتل ہی نہیں ہے، بلکہ خود اپنے آپ کو قتل کرنا بھی ہے اس لیے کہ نفس، جس کو اللہ نے ذی حرمت ٹھیرایا ہے، اس کی تعریف میں دوسرے نفوس کی طرح انسان کا اپنا نفس بھی داخل ہے۔ لہٰذا جتنا بڑا جرم اور گناہ قتلِ انسان ہے، اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی بھی ہے۔ آدمی کی بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی جان کا مالک، اور اپنی اس ملکیت کو باختیارِ خود تلف کر دینے کا مجاز سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ جان اللہ کی ملکیت ہے، اور ہم اس کے اِتلاف تو درکنار، اس کے کسی بے جا استعمال کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ تعالیٰ جس طرح بھی ہمارا امتحان لے، اسی طرح ہمیں آخر وقت تک امتحان دیتے رہنا چاہیے، خواہ حالاتِ امتحان اچھے ہوں یا بُرے۔ اللہ کے دیے ہوئے وقت کو قصداً ختم کر کے امتحان گاہ سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے۔ کجا کہ یہ فرار بھی ایک ایسے جرمِ عظیم کے ذریعہ سے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام

قرار دیا ہے۔اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی دنیا کی چھوٹی تکلیفوں اور ذلتوں اور رسوائیوں سے بچ کر عظیم تر اور ابدی تکلیف ورسوائی کی طرف بھاگتا ہے۔

۳۴۔ بعد میں اسلامی قانون نے قتل بالحق کو صرف پانچ صورتوں میں محدود کر دیا: ایک قتلِ عمد کے مجرم سے قصاص دوسرے دین حق کے راستے میں مزاحمت کرنے والوں سے جنگ۔ تیسرے اسلامی نظامِ حکومت کو اُلٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا۔ چوتھے شادی شدہ مرد یا عورت کو ارتکابِ زنا کی سزا۔ پانچویں ارتداد کی سزا۔ صرف یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں انسانی جان کی حرمت مرتفع ہو جاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

۳۵۔ اصل الفاظ ہیں ''اس کے ولی کو ہم نے سلطان عطا کیا ہے''۔ سلطان سے مراد یہاں ''حجت'' ہے جس کی بنا پر وہ قصاص کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس سے اسلامی قانون کا یہ اصول نکلتا ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مدعی حکومت نہیں بلکہ اولیائے مقتول ہیں، اور وہ قاتل کو معاف کرنے اور قصاص کے بجائے خون بہا لینے پر راضی ہو سکتے ہیں۔

۳۶۔ قتل میں حد سے گذرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ سب ممنوع ہیں۔ مثلاً جوش انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا، یا مجرم کو عذاب دے دے کر مارنا، یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالنا، یا خون بہا لینے کے بعد پھر اُسے قتل کرنا وغیرہ۔

۳۷۔ چونکہ اس وقت تک اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی تھی اس لئے اس بات کو نہیں کھولا گیا کہ اُس کی مدد کون کرے گا۔ بعد میں جب اسلامی

حکومت قائم ہوگئی تو یہ طے کر دیا گیا کہ اس کی مدد کرنا اس کے قبیلے یا اس کے حلیفوں کا کام نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اُس کے نظام عدالت کا کام ہے۔ کوئی شخص یا گروہ بطورِ خود قتل کا انتقام لینے کا مجاز نہیں ہے۔ بلکہ یہ منصب اسلامی حکومت کا ہے کہ حصولِ انصاف کیلئے اسے مدد مانگی جائے۔

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ص وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝ ﴾

(بنی اسرائیل، 34)

(۱۰)۔ مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہونچ جائے۔ ۳۸

(۱۱) عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ ۳۹

۳۸۔ یہ بھی محض ایک اخلاقی ہدایت نہ تھی بلکہ آگے چل کر جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لئے انتظامی اور قانونی، دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں جن کی تفصیل ہم کو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ اسلامی ریاست اپنے اُن تمام شہریوں کے مفاد کی محافظ ہے جو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اَنَا وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ (میں ہر اُس شخص کا سرپرست ہوں جس کا کوئی سرپرست نہ ہو) اسی طرف اشارہ کرتا ہے، اور یہ اسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔

۳۹۔ یہ بھی صرف انفرادی اخلاقیات ہی کی ایک دفعہ نہ تھی بلکہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس کو پوری قوم کی داخلی اور خارجی سیاست کا سنگِ بنیاد ٹھہرایا گیا۔

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل، 35)

(۱۲)۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔[۴۰] یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔[۴۱]

۴۰۔ یہ ہدایت بھی صرف افراد کے باہمی معاملات تک محدود نہ رہی، بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے بعد یہ بات حکومت کے فرائض میں داخل کی گئی کہ وہ منڈیوں اور بازاروں میں اوزان اور پیمانوں کی نگرانی کرے اور تطفیف کو بزور بند کردے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ تجارت اور معاشی لین دین میں ہر قسم کی بے ایمانیوں اور حق تلفیوں کا سدّ باب کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے۔

۴۱۔ یعنی دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں اس کا انجام اس لئے بہتر ہے کہ اس سے باہمی اعتماد قائم ہوتا ہے، بائع اور خریدار دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، اور یہ چیز انجام کار تجارت کے فروغ اور عام خوش حالی کی مؤجب ثابت ہوتی ہے۔ رہی آخرت، تو وہاں انجام کی بھلائی کا سارا دارومدار ہی ایمان اور خدا ترسی پر ہے۔

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــــُٔوْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل، 36)

(۱۳)۔ کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔ [۴۲]

۴۲۔ اس دفعہ کا منشا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں وہم وگمان کے بجائے ''علم'' کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشا کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں، قانون میں، سیاست اور انتظامِ ملکی میں، علوم وفنون اور نظامِ تعلیم میں، غرض ہر شعبہ حیات میں کی گئی اور اُن بے شمار خرابیوں سے فکر وعمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرنے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول طے کر دیا گیا کہ محض شبہے پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے تفتیشِ جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں یہ پالیسی متعین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے اور نہ مجرد شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظامِ تعلیم میں بھی اُن نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن وتخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی اور ایمان لانے والوں کو یہ سکھایا گیا کہ صرف اُس چیز کو مانیں جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے علم کی رو سے ثابت ہو۔

وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ

وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ○ ﴾ (بنی اسرائیل، 37)

(۱۴)۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ [۴۳]

۴۳۔ مطلب یہ ہے کہ جباروں اور متکبروں کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت بھی انفرادی طرزِ عمل اور قومی رویے، دونوں پر یکساں حاوی ہے۔ اور یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ مدینہ طیبہ میں جو حکومت اس منشور پر قائم ہوئی اس کے فرماں رواؤں، گورنروں اور سپہ سالاروں کی زندگی میں جباری اور کبریائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا حتیٰ کہ عین حالتِ جنگ میں بھی کبھی ان کی زبان سے فخر و غرور کی کوئی بات نہ نکلی۔ ان کی نشست و برخاست، چال ڈھال، لباس، مکان، سواری اور عام برتاؤ میں انکسار و تواضع، بلکہ فقیری و درویشی کی شان پائی جاتی تھی، اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے اس وقت بھی اکڑ اور تبختر سے کبھی اپنا رعب بٹھانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

﴿ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ○ ﴾

(بنی اسرائیل، 38)

ان امور میں سے ہر ایک کا بُرا پہلو تیرے ربّ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ [۴۴]

۴۴۔ یعنی ان میں سے جو چیز بھی ممنوع ہے اس کا ارتکاب اللہ کو ناپسند ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں، جس حکم کی بھی نافرمانی کی جائے وہ ناپسندیدہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَ ۃ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ:

اُتِیَ بِفَرَسٍ یَّجْعَلُ کُلَّ خَطْوٍ مِّنْہُ اَقْصٰی بَصرِ ۃ، فَسَارَ وَسَارَ مَعَہٗ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ ،فَاَتٰی عَلٰی قَوْ مٍ یَزْرَعُوْنَ فِیْ یَوْمٍ وَیَحْصُدُ وْنَ فِیْ یَوْ مٍ کُلَّمَا حَصَدُ وْاعَادَ کَمَا کَانَ، فَقَالَ، یَا جَبْرِیْلُ مَنْ ھٰٓؤُ لَآ ءِ، قَالَ،ھٰٓؤُلَآءِ الْمُجَا ھِدُوْنُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ،تُضَا عَفُ لَھُمُ الْحَسَنَۃُ بِسَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ وَّ مَا اَنْفَقُوْ امِنْ شَیْ یُخْلِفُہٗ، ثُمَّ اَ تٰی عَلٰی قَوْ مٍ تُرْ ضَخُ رُءُ سُھُمْ بِا لصَّخْرِ کُلَّمَا رَضِخَتْ عَا دَتْ کَمَا کَا نَتْ،وَلَا یُفَتَّرُ عَنْھُمْ مِّنْ ذٰلِکَ شَیْ ءٌ''،

قَالَ؛ یَا جِبْرِیْلُ مَنْ ھٰوءُ لَآ ءِ؟ قَالَ؛ ھٰوءُ لَآ ءِ الَّذِ یْنَ تَثَا قَلَتْ رُءُ وُ سُھُمْ عَنِ الصَّلَاۃِ، ثُمَّ اَتٰی عَلٰی قَوْمٍ عَلٰی اَدْ بَارِھِمْ رِقَا عٌ''، وَّ عَلٰٓی اَقْبَا لِھِمْ رِقَاعٌ'' یَّسْرَ حُوْ نَ کَمَا تَسْرَحُ الْاَ نْعَامُ اِلَی الضَّرِ یْعِ وَالزَّ قُّوْ مِ وَرَ ضْفِ جَھَنَّمَ، قَالَ؛ مَا ھٰوءُ لَآءِ یَا جِبْرِ یْلُ؟

قَالَ ھٰوءُ لَآ ءِ الَّذِیْنَ لَا یُوءَ دُّ وْنَ صَدَقَاتِ اَمْوَالِھِمْ مَّا ظَلَمَھُمُ اللّٰہُ، وَمَا اللّٰہُ بِظَلَّا مٍ لِلْعَبِیْدِ. ثُمَّ اَتٰی رَ جُلٍ قَدْ جَمَعَ حُزْ مَۃَ عَظِیْمَۃً لَّا یَسْتَطِیْعُ حَمْلَھَا وَھُوَیُرِ یْدُ اَنْ یَّزِ یْدَ عَلَیْھَا، قَالَ،ھٰذَا رَ جُلٌ'' مِّنْ اُمَّتِکَ عَلَیْہِ اَمَا نَۃُ النَّاسِ لَا یَسْتَطِیْعُ اَدَآ ءَ ھَا وَھُوَ یُرِیْدُ اَنْ یَّزِ یْدَ عَلَیْھَا، ثُمَّ اَتٰی عَلٰی قَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَا ھُھُمْ

وَ اَلْسِنَتُهُمْ بِمَقَارِيْضَ مِنْ حَدِيْدٍ، كُلَّمَا قُرِضَتْ عَادَتْ كَمَا كَانَتْ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ مِّنْ ذَالِكَ شَيْءٌ''، قَالَ: يَا جِبْرِيْلُ مَا هٰؤُلَآءِ؟ قَالَ: خُطَبَآءُ الْفِتْنَةِ، ثُمَّ اَتٰى عَلٰى جُحْرٍ صَغِيْرٍ يَّخْرُجُ مِنْهُ ثَوْرٌ ''عَظِيْمٌ'' فَيُرِيْدُ الثَّوْرُ اَنْ يَّدْخُلَ مِنْ حَيْثُ خَرَجَ فَلَا يَسْتَطِيْعُ، قَالَ: مَا هٰذَا يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ: هٰذَا الرَّجُلُ يَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ الْعَظِيْمَةِ فَيَنْدَمُ عَلَيْهَا فَيُرِيْدُ اَنْ يَّرُدَّهَا فَلَا يَسْتَطِيْعُ. (ترغیب وترتیب)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ معرج کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک ایسا گھوڑا لایا گیا جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ اس کا ہر قدم حدِ نظر پر پڑتا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس گھوڑے پر سوار ہو کر جبریل علیہ السلام کی معیّت میں چلے اور آسمان پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جو ہر دن بوتے ہیں اور اسی دن کاٹ لیتے ہیں۔ اور کاٹ لینے کے بعد پھر ان کی کھیتی تیار ہو جاتی ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے جبریلؑ یہ کون لوگ ہیں''؟

انہوں نے کہا، ''یہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں، ان کی ہر نیکی پر سات سو گنا اجر ملتا ہے، جو کچھ انہوں نے دنیا میں خرچ کیا تھا اس کا عوض مل رہا ہے''۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کے سر پتھر سے کچلے جا رہے تھے اور کچلنے کے بعد پھر سر ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔ برابر ان کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے جبریلؑ یہ کون لوگ ہیں'؟

انہوں نے بتایا ''یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں نماز سے سُستی برتتے تھے''؟

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو چیتھڑے پہنے ہوئے تھے اور جس طرح جانور چرتے ہیں اس طرح وہ تھوہڑ اور جھاڑ کانٹے اور جہنم کے گرم

پتھر کھا رہے ہیں جسم پر لباس کا نام نہیں صرف چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ہیں اور کھانے کا نام نہیں اس لیے بھوک سے بیتاب وہ چیز کھا رہے ہیں جو کھانے کی نہیں)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے جبریلؑ یہ کون لوگ ہیں''؟

انہوں نے کہا '' یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، اللہ تو بندوں پر بالکل ظلم نہیں کرتا''۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک ایسے آدمی پر ہوا جس نے ایک بہت بڑا گھڑا اکٹھا کر رکھا ہے جسے وہ اٹھا نہیں سکتا اور برابر اس میں اضافہ کیے چلا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا '' یہ کون شخص ہے''؟

انہوں نے کہا '' یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا وہ آدمی ہے جس نے لوگوں کی بہت سی امانتیں اپنے ذمہ لے رکھی تھیں اور ادا کر نہیں سکتا تھا اور برابر مزید امانت لیتا رہتا''۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ایسے لوگوں کے پاس پہنچے جن کے ہونٹ اور زبانیں قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں اور کاٹ دیئے جانے کے بعد ویسی ہی ہو رہی ہیں جیسی تھیں۔ اور ان کے ساتھ یہ معاملہ بغیر کسی وقفہ کے ہو رہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے جبریلؑ یہ کون لوگ ہیں''؟

انہوں نے بتایا یہ فتنہ اور گمراہی پھیلانے والے مقررین ہیں''۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چھوٹے سوراخ کے پاس پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اس چھوٹے سوراخ سے ایک بہت بڑا بیل نکلا اور پھر اسی سوراخ میں جانا چاہتا ہے لیکن جا نہیں سکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''اے جبریلؑ یہ کیا ہے''؟

انہوں نے بتایا '' یہ شخص اپنی زبان سے غلط لفظ نکالتا پھر پچھتاتا اور اس کی تلافی کرنا چاہتا مگر زبان سے نکلنے کے بعد وہ لفظ کیونکر واپس ہوتا''۔

دُعا

''قلب کی زبان سے''

اگر آپ وہ حیاتِ طیّبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت یہی ہے کہ اِسے خدا سے مانگیں۔ مگر یاد رکھیے، خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کرلیں اور اسے اپنی زبان سے دہرادیا کریں۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے۔ خدا آپ کے لفظوں کو نہیں دیکھتا، وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیّت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دے دے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے رُوح دینداری میں پڑا رہنے دے۔ آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔

جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھیے، یہ مالکِ کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت

میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے ربّ کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا! میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائینات کا مالک تو ہر صبح وشام اپنے سارے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب آ کر آواز دیتا ہے؛

''کون ہے جو مجھ سے مانگے تا کہ میں اسے دوں''۔

مگر جنہیں لینا ہے، وہ سو رہے ہوں، تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

دُعا

اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّیَّةِ وَالْھُدٰی، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٍ ہ

بار اِلٰہا ہمیں توفیق بخش وہ کام کرنے کی جو تیری رضامندی اور خوشنودی کا سبب بنے۔ ہماری بات، ہمارے عمل، ہمارے ہر کام، میری نیت اور ہمارے اختیار کردہ راہِ عمل میں۔

بے شک تو ہر چیز پر پوری قدرت اور غلبہ رکھتا ہے۔ آمین!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنّٰی اِنَّکَ اَنْتَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ